© rasailojaraid.com

ایران میں چند روز

(۵)

سعید احمد اکبر آبادی

ایک روز ہم لوگ طوس گئے۔ یہ مشہد سے ۲۹ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ خراسان کا بہت پرانا یعنی اسلام سے بھی صدیوں پہلے کا شہر ہے۔ لیکن اب ایک گنبد اور ایک قلعہ کے سوا اس عہد کی کوئی اور یادگار باقی نہیں ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر حکیم ابوالقاسم فردوسی المتوفی ۴۱۱ھ مطابق ۱۰۲۰ء کا مقبرہ یہیں ہے۔ سب شہر سے روانہ ہو کر مقبرہ پر ہی ٹھہری۔ فردوسی کا سب سے قدیم اور مستند تذکرہ نظامی عروضی سمرقندی کی کتاب چہار مقالہ میں ہے۔ اس میں نظامی نے لکھا ہے کہ جب لوگ فردوسی کا جنازہ لئے ہوئے طوس کے دروازے پر پہنچے تو اہل شہر نے جنازہ کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اس بنا پر شہر پناہ سے متصل جو باغ خود فردوسی کی ملکیت تھا اس میں اس کو دفن کر دیا گیا۔ نظامی کا بیان ہے کہ سنہ ۵۱۰ھ میں اس نے فردوسی کی قبر دیکھی تھی اب فردوسی کے اس باغ کا کوئی نام و نشان موجود نہیں ہے۔ البتہ سنہ ۱۳۱۳ھ میں قبر پر ایک نہایت عالی شان اور خوبصورت عمارت تعمیر کرائی گئی۔ ایران کے افاضل کا بیان ہے کہ یہ عمارت فن تعمیر کے لحاظ سے آتشکدوں کی عمارت کے مشابہ تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو قومیت کے جنون کے علاوہ اور کیا کہیے۔ سنہ ۱۳۴۳ھ میں حکومت ایران کی طرف سے اور ایک نئی عمارت بنائی گئی جس کی چھت اور ستونوں پر ادھر ادھر فردوسی کے شاہنامہ کے اشعار کندہ ہیں اور اس عمارت کے چاروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف بڑے بڑے لان ہیں اور اس کے ایک جانب میں ریستوران ہے۔

ہارونیہ مقبرہ فردوسی سے چند قدم کے فاصلہ پر ہی ایک بہت پرانی اور بوسیدہ عمارت ہے جسے ہارونیہ کہتے ہیں یہ ایک مربع عمارت ہے جس کا ایک حصہ مسقف ہے اور باقی کھلا ہوا ہے اس کو ہارونیہ کیوں کہتے ہیں؟ علمائے ایران کوئی قطعی بات نہیں کہتے مجھے ایک صاحب نے یہ بھی کہا کہ ہارون رشید نے اس عمارت میں بیت الحکمہ قائم کیا تھا۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ خراساں میں آئے دن بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں اس بنا پر ہارون رشید نے سرحدی مقامات کے تحفظ کے خیال سے طوس میں ایک چھاونی قائم کی تھی اور ہارونیہ اس کا ہیڈکوارٹر تھا۔ ویسے بھی دیکھنے میں یہ عمارت فوجی بیرک جیسی معلوم ہوتی ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ اسی نام کی ایک عمارت ہارون رشید نے ۱۸۳ھ مطابق ۷۹۹ء عراق کے شمالی حصہ میں مرعش اور عین کے درمیان بنوائی تھی یہ عمارت درحقیقت ایک قلعہ تھی جس میں فوجی چھاونی قائم کی گئی تھی اور اس کا مقصد سرحدی مقامات کی حفاظت تھا یاقوت حموی نے معجم البلدان میں اس کا ذکر کیا ہے اس عمارت میں فصیلیں بنی ہوئی تھیں اور دروازہ لوہے کا تھا۔

امام غزالی کے مزار کی تحقیق جس وقت ہم لوگ ہارونیہ کا جائزہ لے رہے تھے ایران کے بعض افاضل نے کہا، کہتے ہیں امام غزالی کی قبر بھی یہیں کہیں تھی۔ لیکن تھی تو کہاں گئی؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اتنے میں ہمیں ایک گوشہ میں ایک گڑھا اور اس کے اندر کسی قبر کی ایک لوح نظر آئی۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے گڑھے میں ہاتھ ڈال کر قبر کے لوح کا تعویز باہر نکال لیا اور اس کو پڑھنے کی ہم سب نے کوشش کی۔ اکثر حروف بالکل مٹ گئے تھے۔ تھوڑے بہت کٹے پٹے جو رہ گئے تھے ان سے قرینۂ غالب اسی بات کا نظر آتا تھا کہ وہ امام غزالی کی قبر کی لوح تھی۔ اس وقت تو ہم لوگ جلدی میں تھے تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لیکن یہ بات میرے دل کو لگ گئی اور میں نے اس سلسلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں جو مطالعہ کیا اس کا حاصل یہ ہے: امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ کے تمام سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ امام عالی مقام کی وفات طوس میں ہوئی اور وہیں دفن کئے گئے۔ چنانچہ صدیوں تک یہ قبر زیارت گاہِ خواص و عوام اور مرجع انام بنی رہی۔ اعیان علما اور اکابر مصنفین نے اپنی تصنیفات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن سمعانی (متوفی ۵۶۲ھ) نے اس قبر کی زیارت کی اور احیاء العلوم کی جو شرح لکھی ہے اس کے مقدمہ میں اسکا تذکرہ کیا۔ اسی طرح یاقوت حموی نے ۶۲۱ھ میں مزار کی نشاندہی کی ہے۔ ابن بطوطہ ۷۵۶ھ میں طوس کی سیاحت کے سلسلہ میں امام ہمام کی قبر پر حاضری کا تذکرہ کرتا ہے۔ مہمان نامۂ بخارا میں فضل اللہ بن روزبہانی م ۹۲۷ھ ۱۵۲۱ء بھی لکھتا ہے کہ مشہد سے وہ طوس گیا اور امام غزالی کی قبر پر حاضر ہوا۔

علاوہ ازیں پروفیسر زویمر (ZWEMER) نے ایک کتاب امام غزالی پر لکھی تھی جس کا ترجمہ فارسی میں آقائے علی اصغر حکمت نے کیا تھا۔ اس کتاب میں زویمر نے امام غزالی کی قبر کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ پادری ڈونلڈسن (DONALD SON) جس نے مشہد میں مشنری کام کے سلسلہ میں چالیس برس تک قیام کیا تھا اس سے دریافت کر کے لکھا تھا۔ ڈونلڈسن نے قبر دیکھی تھی اور اس کا فوٹو بھی لیا تھا۔ زویمر نے فوٹو اپنی کتاب میں چھاپا ہے اور قبر کی لوح پر امام عالی مقام کا جو نام اور کنیت کندہ تھے ان کا فوٹو بھی درج کیا ہے ڈونلڈسن کا بیان ہے۔

سنگ قبر بسیار سائیدہ و فرسودہ	قبر کا پتھر بہت گھس گیا اور پرانا ہوگیا ہے
شدہ و متعمداً قسمتے از آنرا ہم شکستہ	اور اس کے ایک حصہ کو جان بوجھ کر توڑا
و بریدہ و خواستہ اند ہرچہ بر آں	گیا۔ کاٹا پیٹا گیا اور اکھیڑا گیا ہے اس پر
منقوش بودہ بتراشیدند و محو کردند	جو کچھ منقوش تھا اس کو بھی چھیل چھال
	دیا اور مٹا دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہماری تاریخ کے قلب دجگر کے وہ داغ ہیں جن کو دیکھئے اور شرمایئے۔ سنیوں کا زور ہوا تو انھوں نے شیعہ اکابر اور ان کے بزرگوں کی قبریں اکھاڑ برابر کردیں۔ جیسا کہ متوکل علی اللہ کے زمانہ میں ہوا۔ اسی طرح شیعوں کا قابو چلا تو انھوں نے سنیوں کے اکابر علماء ومشائخ کی تربتوں کو نیست ونابود کرکے دم لیا۔ چنانچہ امام غزالی کی قبر صدیوں تک مرجع انام رہنے کے بعد اسی جنون کی نذر ہوئی۔ اسی طرح نیشاپور جس کا ذکر آگے آرہا ہے اس کے قرب وجوار میں نصرآباد کے نام سے ایک گاؤں ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ مشہور محدث امام مسلم کی قبر اسی گاؤں میں تھی لیکن اس کا بھی آج کوئی نام ونشان موجود نہیں ہے۔ اور پھر شیعہ سنی کا کیا ذکر۔! خود سنیوں نے سنیوں اور ارباب تشیع نے شیعوں کے ساتھ بلکہ بھائیوں نے بھائیوں کے ساتھ کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہے۔!

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد زتو احتراز کردن

ایران کے موجودہ شہنشاہ آریہ مہر اور وہاں کے علماء ارباب دانش لائق مبارکباد ہیں کہ ان پرانے زخموں کے دھونے اور شیعہ سنی اختلافات کو کم سے کم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عیسیٰ صدیق استاد تہران یونیورسٹی جنھوں نے آرامگاہ غزالی کے نام سے ایک محققانہ کتابچہ شائع کیا ہے زویمر کی کتاب کے حوالہ سے امام عالی مقام کے مزار کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔" مقبرہ فردوسی کی ازسرنو تعمیر اور اس سے ملحقہ باغات کی توسیع وتزئین جدید کے بعد ہی ایران کے آثار قدیمہ وملیہ کی انجمن کے حکم سے ہارونیہ کے اطراف وجوانب میں جو زمین پڑی ہوئی تھی پیمائش کرکے اس کی کھدائی کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ پورا علاقہ قبرستان تھا، چنانچہ اس علاقہ کے ٹیلوں پر کچھ قبریں کسی نہ کسی شکل میں اب بھی باقی ہیں۔ وزارت تعلیم نے ایک اعلان کے ذریعہ اس پورے خطہ کو اب آثار ملی کی فہرست میں شامل کرلیا ہے۔ امام غزالی کی قبر کا سنگ لوح جس کا فوٹو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زومیر نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے وہ بھی دستیاب ہوگیا ہے اور اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ ہارونیہ سے متصل جو قبرستان تھا امام غزالی کی قبر اسی میں تھی۔ سنگ لوح کو حفاظت کے خیال سے ہارونیہ کے اندر رکھ دیا گیا ہے (یہی وہ سنگ لوح تھا جسے ہم نے دیکھا تھا)، بہر حال یہ سب کچھ تو وہ تھا جو محکمہ آثار ملیہ ایران نے کیا، خوشی کی بات یہ ہے کہ گذشتہ سال ۱۰ ارماہ اردی بہشت ۱۳۴۸ھ کو جب شہنشاہ آریہ مہر نے مقبرہ فردوسی کی تعمیر جدید کا افتتاح کیا تو ساتھ ہی فرمان جاری کیا کہ ایک مقبرہ تعمیر کر کے امام غزالی کے سنگ مزار کو اس میں نصب کیا جائے تاکہ امام صاحب کی یادگار قائم رہ سکے۔ چنانچہ اس فرمان پر عمل درآمد شروع ہوگیا ہے۔

طوس میں بس یہی دو چیزیں (فردوسی کا مقبرہ اور ہارونیہ) دیکھنے کی تھیں جب ان سے فارغ ہو گئے تو واپسی میں مشہد یونیورسٹی کے مختلف شعبوں اور کالجوں کو بھی دیکھا۔ اس یونیورسٹی کا کوئی کیمپس نہیں ہے بلکہ کوئی کالج کہیں ہے اور کوئی کہیں۔ اس طرح پورے شہر میں یہ یونیورسٹی پھیلی ہوئی ہے۔ طلبا کا ہوسٹل بھی دیکھا۔ یہاں ہر چیز بالکل ماڈرن اور ٹپ ٹاپ ہے۔ کھانے وغیرہ سب برقی چولہوں پر تیار ہوتے ہیں۔ ڈائننگ ہال، کمرے، کامن روم وغیرہ ہر جگہ اعلیٰ قسم کے فرنیچر کا انتظام ہے۔ یونیورسٹی کی نسبت یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ آگے چل کر جب ایران کے نظام تعلیم پر گفتگو ہوگی تو اس سلسلہ کے دوسرے امور بھی زیر بحث آئیں گے۔

نیشاپور کانفرنس کے پروگرام کے ماتحت ایک روز ہم سب نیشاپور گئے۔ اس شہر کو تاریخ اسلام میں جو اہمیت وشہرت حاصل ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ شہر علم وادب، شعر وفن اور فلسفہ وتصوف کا گہوارہ رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ایک سیاسی مرکز بھی، چنانچہ ابومسلم خراسانی جس نے بنو امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اس کا مرکز یہی شہر تھا۔ وہ یہاں ۱۳۱ھ میں داخل ہوا اور ایک مسجد کی تعمیر کی۔ ابومسلم کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد اس شہر کی شہرت طاہر بن حسین کی وجہ سے ہوئی جس کا لقب ذوالیمینین تھا۔ یہ اگرچہ مامون رشید کی طرف سے مشرقی ایران کا گورنر تھا۔ لیکن باغی ہو کر اس نے خود اپنی حکومت قائم کی اور نیشاپور کو دارالحکومت قرار دیا۔ یہ حکمران خاندان اس کی نسبت سے طاہریہ کہلاتا ہے۔ ۲۷۹ھ میں صفاریوں نے طاہریہ کو شکست دے کر حکومت پر قبضہ کر لیا لیکن جب سامانیوں کا دورِ حکومت آیا تو انھوں نے نیشاپور کے بجائے بخارا کو دارالحکومت بنایا۔ اس زمانہ میں نیشاپور کی سیاسی حیثیت اگرچہ کمزور ہو گئی تھی لیکن علم و ادب میں اسکی ترقی کا خاص زمانہ یہی ہے۔ دولت غزنویہ کے زوال تک اس کا حال یہی رہا۔ اس کے بعد جب سلجوقیوں کا عہد شروع ہوا تو نیشاپور کو علمی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے عروج حاصل ہوا۔ سلطان طغرل کا نیشاپور میں ورود ۳۲۹ھ میں ہوا اور اس نے اسکو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ الپ ارسلان بھی ایک عرصہ تک یہاں مقیم رہا۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے زمانہ میں نیشاپور نے وہ ترقی کی کہ عالم اسلام میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ لیکن چنگیز خاں کے عہد میں اس کو عظیم نقصان پہنچا۔ چنگیز کے لڑکے تولو نے شہر پر قبضہ کر کے قتل عام اس درجہ کیا کہ صرف چارسو کاریگر محض اپنے ہنر کے باعث محفوظ رہ سکے۔ صفوی عہد سلطنت کے آغاز میں افاغنہ کی طرف سے پھر اس پر پے بہ پے حملے اس درجہ شدید ہوئے کہ اینٹ سے اینٹ بج گئی اور ایک مکان بھی قابل رہائش نہیں رہا۔ فریزر ۱۸۲۱ء میں یہاں آیا تھا اسکا بیان ہے کہ اس سال نیشاپور میں رہنے والوں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

یہ نیشاپور کی قدیم تاریخ ہے۔ آج وہ متوسط درجہ کا اچھا خاصہ شہر ہے مشہد سے ۱۳۷ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ راستہ پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا ہے۔ اس لئے پر از نشیب و فراز بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ درمیان میں دریائے سادہ بھی پڑا جس کا تاریخ میں ذکر آتا ہے۔ جن پہاڑیوں کے درمیان سے ہماری بسیں گذر رہی تھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ وہی پہاڑیاں ہیں جن سے نکل کر حملہ آوروں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ حملہ کو جو چاہئے کہہ لیجئے لیکن ان افغانوں اور مغلوں کی ہمت و شجاعت اور مردانگی کی داد لازمی طور پر دینی پڑتی ہے۔ صبح ناشتہ کے بعد ہوٹل سے روانہ ہوئے تھے۔ چار ساڑھے چار گھنٹے کے بعد نیشاپور میں داخل ہو گئے۔ اس میں اب تک قدامت جدت پر غالب ہے۔ نئے طرز کی عمارتیں اگرچہ کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ لیکن اکثریت پرانے وضع کے مکانوں کی ہے۔ مردوں اور عورتوں کا لباس بھی عموماً ان کا اپنا قومی لباس ہے۔ عورتیں جب باہر نکلتی ہیں تو ایک بڑی لانبی سی چادر جو عموماً سیاہ ہوتی ہے سر سے پیر تک اس سے اپنا بدن چھپا لیتی ہیں یہ گویا ان کا برقعہ ہے۔ صرف آنکھیں اور چہرہ کا ایک حصہ کھلا رہتا ہے۔ جو عورتیں اسکرٹ استعمال کرتی ہیں وہ بھی دبیز قسم کے موزوں سے اپنی ٹانگیں چھپائے رہتی ہیں اور ان کے سر پر ایک بڑا رومال ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رضا شاہ پہلوی پر چونکہ مغرب پرستی کا جنون سوار تھا اس لئے اس نے پردہ کو قانوناً ممنوع قرار دیا اور اس میں اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ سپاہیوں کو حکم دیا کہ اگر کسی مکان میں کوئی عورت چادر اوڑھ کر نماز پڑھتی ہوئی بھی نظر آئے تو اس کی چادر بلا کر کھینچ لی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پردہ بالکل غائب ہو گیا۔ لیکن جب موجودہ شہنشاہ آریہ مہر سریر آرائے حکومت ہوئے تو چونکہ یہ خود مذہبی آدمی ہیں اور طبیعت میں بڑا اعتدال و توازن ہے اس لئے انھوں نے دوسری اصلاحات کے ساتھ یہ بھی کیا کہ بے پردگی کے حکم کو منسوخ کر کے ہر عورت کو آزادی دی کہ وہ چاہے تو پردہ کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ ایرانی احباب نے بتایا کہ اس فرمان شاہی کا شائع ہونا تھا تو نوے فیصدی عورتیں اپنی قدیم وضع کے مطابق پردہ کرنے لگیں۔ یہ قدیم وضع کا پردہ تہران جیسے شہروں میں خال خال نظر آتا ہے۔ لیکن نیشاپور جیسے الگ تھلگ اور پرانی وضع کے شہروں میں عام ہے۔ یہاں یہ ذکر ضمناً آ گیا۔ ورنہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں میں ایران کی جدید معاشرت اور تہذیب پر گفتگو کروں گا وہاں اس کا ذکر مفصل آئے گا۔

مقبرہ شیخ فریدالدین عطار نیشاپور میں داخل ہو کر ہم پہلے شیخ فریدالدین عطار کے مقبرہ پر گئے۔ شیخ کا بحیثیت شاعر و صوفی جو مقام ہے ارباب علم اس سے باخبر ہیں۔ نثر میں ان کی کتاب "تذکرۃ الاولیاء" اور نظم میں "منطق الطیر" اور ان کی کلیات جو مثنوی غزل اور قطعہ و رباعی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ بہت مشہور و معروف ہیں۔ پہلے یہ قبر سادہ تھی اور اس پر کوئی عمارت نہیں تھی۔ لیکن موجودہ حکومت نے اس طرف توجہ کی تو مقبرہ کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ ابھی عمارت مکمل نہیں ہے گنبد بہرحال بن چکا ہے جس پر قسم قسم کے پتھروں سے میناکاری اور پچی کاری کا کام کیا گیا ہے گنبد کے اندرونی جانب جناب شیخ کے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

تاریخ پیدائش ۵۱۳ھ مطابق ۱۱۱۹ء ہے۔ لیکن تاریخ وفات سے متعلق سخت اختلاف ہے۔ عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ۶۲۷ھ میں منگول حملہ آوروں کے ہاتھوں شہید ہوئے لیکن اگر یہ صحیح ہے تو اس حساب سے ان کی عمر ایک سو چودہ برس ہوتی ہے۔ جو بظاہر قرین قیاس نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نیشاپور پر منگولوں کا حملہ ۶۱۶ھ میں یعنی تاریخ وفات سے دس برس پہلے ہوا ہے۔ اس بنا پر غالباً صحیح وہی تاریخ ہے جو شیخ کے مزار پر میر شیر علی کی طرف سے ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس میں درج ہے اور وہ ۵۸۶ھ ہے۔ لیکن پروفیسر سعید نفیسی کو پہلی ہی تاریخ پر اصرار ہے۔ فوائد الفواد میں جو حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ ایک واقعہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ جب منگولوں نے نیشاپور پر حملہ کیا تو حاکم نیشاپور نے ایک قاصد کے ذریعہ شیخ فریدالدین عطار سے درخواست کی کہ وہ خدا سے اس مصیبت کے ٹل جانے کی دعا کریں۔ شیخ نے اس کا جواب دیا۔ دعا کا وقت گذر چکا ہے اب جس کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے اسکو بھگتنے کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔

(باقی)

© rasailojaraid.com